Policy Journal of Social Science Review

Online ISSN 3006-4635

Print ISSN 3006-4627

Vol. 4 No. 1 (2026)

Human Suffering and the Crisis of Individual Identity in Modern Urdu Short Story

جدید اردو افسانے میں انسانی کرب اور فرد کی شناخت کا بحران

[1]Dr. Uzma Noreen
[*2]Dr. Syed Ashfaq Hussain Bukhari
[3]Anayat ur Rehman
[1]Lecturer Urdu Department G.C Women University Sialkot
[*2]Professor Department of Urdu My University Islamad
[3]Scholar PhD Department of Urdu Alhamd Islamic University Islamabad
[*2]collegeeast@gmail.com

Abstract

The narrative of human anguish and meaninglessness in modern Urdu short story reflects the inner restlessness, existential crisis and decline of values of modern man. Although modern industrial and scientific development has provided convenience to human life, as a result, man has also suffered from loneliness, meaninglessness and spiritual emptiness. This same condition is revealed in the form of meaninglessness in modern fiction writers, where the characters seem to be wandering in search of their identity, purpose of life and meaning of existence. In these fictions, social chaos, moral decline, breakdown of relationships and distance from ancient values have been presented in symbolic and allegorical form, through which the anguish, anxiety and intellectual disorientation of modern man are effectively highlighted. Their names and themes are as follows. Intizar Hussain has presented migration, civilizational decline, loneliness, existential anguish, and the recovery of the past in his stories. Anwar Sajjad presents the psychological complexity, internal conflict, and existential meaninglessness of modern man in a symbolic manner. Thus, Balraj Main Ra, in his writings, gives space to modern urban life, uncertainty, waiting, and existential feelings in his stories.

Keywords: Modern Urdu short story, Human Anguish, Meaninglessness, Intizar Hussain, Anwar Sajjad, Balraj Main Ra, Uncertainty, Existentialism, Psychological Complexity, Internal Conflict.

Article Details:

Received on 30 Dec, 2025
Accepted on 29 Jan, 2026
Published on 30 Jan, 2026

Corresponding Authors*
Dr. Syed Ashfaq Hussain Bukhari

Policy Journal of Social Science Review
Online ISSN 3006-4635
Print ISSN 3006-4627
Vol. 4 No. 1 (2026)

جدید دور کے انتشار، سماجی بے ترتیبی، تہذیبی زوال اور تیزی سے بدلتے ہوئے حالات نے انسان کی شخصیت اور اس کے وجود کو گہرے بحران سے دوچار کر دیا ہے۔ نتیجتاً انسان نہ صرف اپنے گرد و پیش کے ماحول سے اجنبیت محسوس کرنے لگا ہے بلکہ اپنی ذات، شناخت اور وجود پر بھی اس کا اعتماد متزلزل ہو گیا ہے۔ وہ ہر لمحہ بے یقینی، اضطراب اور ذہنی کشمکش کا شکار رہتا ہے، جس کے باعث اس کی انفرادی اور اجتماعی زندگی شدید متاثر ہوتی ہے۔ جدید انسان کی یہی داخلی بے چینی، احساسِ تنہائی اور شناخت کا بحران عصرِ حاضر کے اردو افسانے کے بنیادی موضوعات میں شمار ہوتے ہیں۔اسی لیے جدید اردو افسانہ نگار اپنے عہد کے انسان کی نفسیاتی، سماجی اور وجودی کیفیت کو نہایت گہرے فکری شعور اور فنکارانہ مہارت کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں فرد کی داخلی کشمکش، روحانی خلا، رشتوں کی شکست و ریخت، تہذیبی بیگانگی، اقدار کا زوال اور بدلتے ہوئے سماجی حالات کے اثرات نمایاں طور پر دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں کہ جدید معاشرہ بظاہر ترقی اور آسائشوں کی طرف بڑھ رہا ہے، لیکن اس ترقی نے انسان کو ذہنی سکون، روحانی اطمینان اور اپنی اصل شناخت سے دور کر دیا ہے۔چنانچہ جدید معاشرتی انتشار، انسانی محرومی، وجودی اضطراب، بے معنویت، تنہائی اور شناخت کی تلاش ایسے موضوعات ہیں جو جدید اردو افسانے کا بنیادی سرمایہ بن گئے ہیں۔ ان موضوعات کے ذریعے افسانہ نگار نہ صرف فرد کے داخلی کرب اور نفسیاتی الجھنوں کی عکاسی کرتے ہیں بلکہ اپنے عہد کے سماجی، تہذیبی اور اخلاقی بحران کو بھی مؤثر انداز میں سامنے لاتے ہیں، جس سے جدید اردو افسانہ اپنے دور کی حساس اور معتبر ادبی دستاویز کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔اس حوالے سے آج کے جدیدافسانے کے حوالے سے گوپی چندنارنگ یوں لکھتے ہیں۔

> "یہاں انسان اپنی فطرت کے پیکر میں وقت اور فطرت کا اشتراک بن جاتا ہے اور وابستگی اور ناوابستگی کے دائرے میں گردش کرتے ہوئے اپنی وقعت اور بے وقعتی سے بالکل اسی طرح دو چارہے جیسے جنگل سے وابستہ اور کٹی ہوئی لکڑیاں ۔ جس طرح لکڑیاں جنگل سے جدا ہو کر ایک غیر فطری صورت حال سے دو چار ہوتی ہیں تو انسان بھی اجتماعی زندگی سے کٹ کر بے دست و پاہوجاتاہے ۔۔۔ اجتماعی زندگی سے کلی وابستگی کا خاتمہ ، اگر چہ احساس محرومی کو جنم دیتا ہے، تا ہم انفرادیت فرد کواپنی ذاتی کائنات اور اس کے مسائل سے ہم کنار کرنے میں معاون بناتی ہے "۔ ا

Policy Journal of Social Science Review
Online ISSN 3006-4635
Print ISSN 3006-4627
Vol. 4 No. 1 (2026)

جدید اردو افسانے میں انسانی کرب، خود شناسی کی جستجو اور قدیم ثقافتی اقدار سے انحراف ایک نمایاں رجحان ہے۔ کلام حیدری کے افسانوں میں یہ رجحان واضح طور پر نظر آتا ہے، جہاں لایعنیت، فکری بے سمتی اور نئی انسانی صورتِ حال کی عکاسی کی گئی ہے۔ ان کے افسانہ "اسیر" میں قدیم ثقافت سے انحراف اور بدلتی ہوئی سماجی و فکری اقدار کو مؤثر علامتی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔

> "بدھ دیو آپ نے یہ کیا نروان حاصل کیا ہے کہ ہزاروں لاکھوں پتھروں کے پیکر میں ڈھل کر مقید ہو گئے ہیں۔ یہ قید کیسی سخت اور بے جان ہے کہ اس سے سر ٹکرا کر لہولہان ہی ہوا جا سکتا ہے۔ آزادی نصیب نہیں ہو سکتی ۔ بدھ دیو آپ حقیقت کے حصار میں مقید ہیں کیا؟"۔ ۲

غرض یہ کہ افسانے کا کردار قدیم ثقافتی اقدار سے انحراف کرتے ہوئے زندگی کی لایعنیت، روحانی کرب اور انسان کی گمشدگی کے احساس کو نمایاں کرتا ہے۔ وہ مسلسل اذیت بھری زندگی کے بجائے ایک ہی بار موت کو ترجیح دیتا ہے تاکہ اس اضطراب سے نجات حاصل ہو سکے۔ جس آزادی کی جستجو کلام حیدری کے افسانوں میں ملتی ہے، اسی آزادی کی تلاش انور عظیم کے کرداروں میں بھی دکھائی دیتی ہے، جو بے بسی، مجبوری اور بیگانگی کا شکار ہیں۔ ان کے افسانہ "آزردہ ستاروں کا ہجوم" میں زندگی کی بے معنویت اور اجنبیت (Alienation) کو جدید میکانکی زندگی کے تناظر میں پیش کیا گیا ہے۔ جہاں کردار باہمی گفتگو کے ذریعے اپنے وجودی بحران اور معاشرتی بیگانگی کے احساس کا اظہار کرتے ہیں۔اسی افسانے سےایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> "ہم سب کتنے اکیلے ہیں ۔ کتنے اداس اور زندگی ہے کہ ہم سے الگ کہیں دور سراب کی طرح چک رہی ہے۔ زندگی کا چشمہ بہ رہا ہے اور جھلملا رہا ہے ۔ ہم اسے صرف دیکھ سکتے ہیں ۔ اس میں یہ نہیں سکتے ۔ کیوں کہ ہم بے بس ہیں ۔ ہم نا اپنی خوشی سے پیدا ہوتے ہیں اور نہ اپنی خوشی سے مریں گے۔ "اپنی خوشی آئے نہ اپنی خوشی چلے" کتنی لغو ہے یہ زندگی اور شاید موت بھی"۔ ۳

زندگی کی بے معنویت اور وجودی بحران کا احساس صرف اسی ایک افسانے تک محدود نہیں رہتا بلکہ "دلوں کی رات" میں بھی پوری شدت کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے۔ اس افسانے میں مصنف نے جدید شہری زندگی کی تیز رفتار، مشینی اور بے ہنگم فضا کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کیا ہے۔

Policy Journal of Social Science Review
Online ISSN 3006-4635
Print ISSN 3006-4627
Vol. 4 No. 1 (2026)

جہاں انسان مسلسل مصروفیات، شور و غل، ہجوم اور مادی خواہشات کے درمیان اپنی حقیقی شناخت، سکون اور داخلی توازن سے محروم ہوتا چلا جاتا ہے۔ ظاہری طور پر زندگی پوری سرگرمی کے ساتھ آگے بڑھتی ہوئی دکھائی دیتی ہے، لیکن باطن میں انسان شدید تنہائی، بے چینی اور روحانی خلا کا شکار نظر آتا ہے۔ یہی کیفیت جدید انسان کے وجودی المیے کی علامت بن جاتی ہے۔افسانے کا مرکزی کردار راکیش اسی داخلی انتشار اور ذہنی کشمکش کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ زندگی کے معمولات کو نبھاتے ہوئے بھی اپنے وجود کی معنویت تلاش کرنے میں ناکام رہتا ہے۔ اس کے لیے روزمرہ کی سرگرمیاں محض ایک بے مقصد تسلسل بن کر رہ جاتی ہیں، جن میں نہ کوئی حقیقی خوشی ہے اور نہ ہی اطمینان۔ راکیش کی شخصیت اس جدید انسان کی تصویر پیش کرتی ہے جو بظاہر معاشرے کا فعال فرد ہے۔ لیکن اندر سے شدید احساسِ تنہائی، وجودی بے یقینی اور مایوسی میں مبتلا ہے۔ اس کے خیالات اور احساسات اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ جدید معاشرے کی مادہ پرستی، مسلسل دوڑ دھوپ اور انسانی رشتوں کی کمزوری نے انسان کو اپنی ذات سے بھی دور کر دیا ہے۔ یوں "دلوں کی رات" صرف ایک فرد کی کہانی نہیں بلکہ پورے جدید انسان کے وجودی کرب، بے معنویت، روحانی خلا اور شناخت کے بحران کی ایک گہری اور علامتی تصویر بن کر سامنے آتا ہے۔اقتباس یہ ہے۔

"زندگی کیا ہے؟ ایک دن اور کٹ گیا ، کل پھر وہی لمبی لمبی گیلریز ، وہی کانٹ چھانٹ،
وہی انٹرویوز،وہی مشینوں کی گڑگڑاہٹ، اس کا سر پھٹنے لگا "۔۴

انور عظیم کے افسانوں میں انسانی محرومی، گھٹن اور اخلاقی زوال کی گہری عکاسی ملتی ہے۔ افسانہ "قتل برائے قتل" کا مرکزی کردار جیمز بونڈ والدین کی محبت سے محرومی اور ان کی ناکام ازدواجی زندگی کے تلخ تجربات کے باعث رشتوں پر اپنا اعتماد کھو دیتا ہے۔ یہی حالات اس کی شخصیت کو احتجاج، تشدد اور نفسیاتی انتشار کی طرف لے جاتے ہیں، جس کے نتیجے میں اس کی سوچ میں اخلاقی اقدار کا زوال نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس کی گفتگو اس باطنی بحران اور فکری بے یقینی کی واضح ترجمان ہے۔جیمز بونڈ نہ صرف ماں کی ممتا اور باپ کی محبت کو جھٹلاتا ہے بلکہ ہر انسانی رشتے پر عدم اعتماد کا اظہار کرتا ہے۔ اس کی شخصیت میں رشتوں سے بیزاری اور نفسیاتی الجھن نمایاں ہے، جو کسی حد تک منٹو کے افسانہ "پھندنے" کی یاد دلاتی ہے۔ وہ ہر تعلق کو تباہ کرنا اور ہر عورت پر اپنی برتری قائم کرنا چاہتا ہے، مگر افسانے کے اختتام پر نیلا کے سامنے اس کی داخلی کمزوری آشکار ہو جاتی ہے۔ اپنی ناکامی اور احساسِ شکست کے زیر اثر

Policy Journal of Social Science Review
Online ISSN 3006-4635 Print ISSN 3006-4627
Vol. 4 No. 1 (2026)

وہ ایک بلی کو مار کر اپنے تشدد آمیز رجحان کی تسکین کرتا ہے۔ اس کردار کی یہ پیچیدگی دراصل اس کی داخلی کشمکش، نفسیاتی انتشار اور وجودی بحران کی غماز ہے۔

معاشرے میں پھیلتی ہوئی برائیوں، اخلاقی زوال اور سماجی تضادات کو گندر پال نے بھی اپنے افسانوں میں علامتی انداز سے پیش کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کا افسانہ "عفریت" ایک اہم مثال ہے۔ جس میں راون دہن کی روایت کو محض مذہبی یا ثقافتی رسم کے طور پر نہیں بلکہ ایک گہری سماجی علامت کے طور پر برتا گیا ہے۔ افسانہ اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ ہر سال صرف مصنوعی راون کو نذرِ آتش کیا جاتا ہے، جبکہ معاشرے میں موجود حقیقی راون، یعنی ظلم، بدعنوانی، نفرت، تشدد اور خود غرضی، مسلسل طاقتور ہوتے جا رہے ہیں۔ یوں راون ایک ایسے عفریت کی علامت بن جاتا ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ مزید مضبوط اور خوفناک ہوتا جا رہا ہے۔افسانے میں باپ اور بیٹے کے درمیان ہونے والی گفتگو اسی علامتی تصور کو واضح کرتی ہے۔ اس مکالمے کے ذریعے مصنف نئی نسل کو اس حقیقت سے آگاہ کرتا ہے کہ اصل برائی بیرونی مظاہر میں نہیں بلکہ انسان کے کردار اور معاشرتی رویوں میں پوشیدہ ہے۔ افسانے میں دہشت گردی کے واقعے کے بعد پیدا ہونے والی بھگدڑ اور خوف کی فضا بھی اسی اخلاقی اور سماجی بحران کی نمائندگی کرتی ہے۔ اختتامیہ منظر اس لحاظ سے نہایت معنی خیز ہے کہ وہ قاری کو یہ احساس دلاتا ہے کہ جب تک معاشرے کے حقیقی راون کا خاتمہ نہیں ہوگا، محض علامتی رسمیں ادا کرنے سے برائی کا خاتمہ ممکن نہیں۔ اس طرح "عفریت" جدید معاشرے کے اخلاقی انحطاط، دہشت، منافقت اور بڑھتی ہوئی سماجی برائیوں پر ایک مؤثر علامتی احتجاج بن کر سامنے آتا ہے۔

"رام لیلا گراؤنڈ میں بکھری بکھری چیخ پکار اب شادماں نعروں کی منتظم گونج میں ڈوبنے لگی تھی۔

"پپا۔ ہماری گاڑی نے حرکت کی تو موہت نے منہ میں روکا ہوا سوال اُگل ہی دیا

"کیا روان کاغذ کا بنا ہوا تھا؟"

نہیں، کیوں؟" میں اُسے پھر ڈانٹ کر چپ رہنے کو کہنا چاہتا تھا مگر پوچھ بیٹھا ۔

"تو پھر یہ لوگ ہر سال کاغذ کا راون کیوں جلاتے ہیں ؟

Policy Journal of Social Science Review
Online ISSN 3006-4635 Print ISSN 3006-4627
Vol. 4 No. 1 (2026)

"چپ!" میں اُسے کیا بتاتا ؟۔ کیوں کہ اصل راون ہر سال بچ کر نکل جاتا ہے
۔" ۵

عصرِ حاضر میں شناخت کے بحران، وجودی بے یقینی اور مسلسل جدوجہد میں مبتلا انسان کی تصویر افسانہ "بے گور" میں نہایت مؤثر انداز میں پیش کی گئی ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار ایک امریکی ڈاکٹر کے لیے مردہ انسانوں کا انتظام کرنے کی ذمہ داری قبول کرتا ہے، لیکن جب اس کے سامنے زندہ لوگ آتے ہیں تو وہ حیرت اور اضطراب میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ اگرچہ یہ لوگ جسمانی طور پر زندہ ہیں، مگر روحانی، اخلاقی اور جذباتی اعتبار سے گویا مردہ ہو چکے ہیں۔ یہی احساس افسانے کو محض ایک واقعے سے بلند کر کے جدید انسان کی وجودی بے معنویت اور شناخت کے بحران کی علامت بنا دیتا ہے۔ اس طرح "بے گور" جدید معاشرے میں انسان کی داخلی تنہائی، مقصدِ حیات سے دوری اور روحانی زوال کی نہایت گہری اور فکر انگیز عکاسی کرتا ہے۔ افسانے کا یہ منظر قاری کو اس تلخ حقیقت سے روشناس کراتا ہے کہ آج کا انسان بظاہر زندہ ہونے کے باوجود اپنے باطن، احساسات اور اصل شناخت سے محروم ہو چکا ہے۔

Policy Journal of Social Science Review

Online ISSN 3006-4635

Print ISSN 3006-4627

Vol. 4 No. 1 (2026)

"امریکی ڈاکٹر نے دیکھا کہ کئی پھٹے حال بوڑھے، جوان اور بچے گلی میں ایک طرف قطار باندھے کھڑے ہیں۔

"یہاں کہاں لے آئے ہو ؟"۔

"جہاں ہمیں آنا تھا " رام دین گاڑی سے نکلتے نکلتے بات پوری کرنے کے لئے رک گیا۔

'آپ کے پاس آنے سے پہلے میں ہی انھیں یہاں کھڑا کر گیا تھا۔"

"مگر میں نے تو مردوں کا آرڈر دیا تھا ۔"

"غور سے دیکھئے صاحب ، کیا یہ لوگ آپ کو زندہ معلوم ہوتے ہیں؟"۔

"مجھے یہ مذاق پسند نہیں ، رام دین !"

"میں مذاق نہیں کر رہا ہوں صاحب ، مردوں کو تو اپنے مر چکنے کا احساس بھی نہیں ہوتا مگر انھیں غورسے دیکھئے، ہر ایک کو پورا احساس ہے کہ وہ مر چکا ہے ۔"۔۶

افسانے میں جب ڈاکٹر ان حالات کو دیکھتا ہے تو شدید حیرت اور ذہنی اضطراب کا شکار ہو جاتا ہے۔یہاں تک کہ اس کا سر چکرانے لگتا ہے۔ اس کے برعکس رام دین اپنے ملک کے بدحال، محروم اور مسائل میں گھرے ہوئے لوگوں کا ذکر نہایت طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں کرتا ہے، جیسے یہ سب معمول کی بات ہو۔ اس کے رویے سے یہ احساس ابھرتا ہے کہ مسلسل محرومی اور بدحالی نے اس کی حاسیت کو اس قدر ماند کر دیا ہے کہ وہ المیے کو بھی مذاق کا رنگ دے کر بیان کرنے لگا ہے۔ جب ڈاکٹر اس کے اس غیر سنجیدہ طرزِ عمل پر ناراضی کا اظہار کرتا ہے اور اسے حالات کی سنگینی کا احساس دلانے کی کوشش کرتا ہے، تو رام دین اپنے مخصوص انداز میں جواب دیتا ہے، جو نہ صرف اس کی نفسیاتی کیفیت کی عکاسی کرتا ہے بلکہ اس معاشرے کی اجتماعی بے حسی، مجبوری اور تلخ حقیقت کو بھی آشکار کرتا ہے۔ اس مکالمے کے ذریعے افسانہ نگار یہ واضح کرتا ہے کہ مسلسل غربت، استحصال اور سماجی ناانصافی نے انسان کو اس مقام پر پہنچا دیا ہے جہاں وہ اپنے ہی دکھوں پر ہنسنے اور انہیں معمول کا حصہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا ہے۔یہ اقتباس ملاحظہ ہو ۔

"آپ کی میڈیکل سائنس تو ہماری سائنس سے بہت آگے نکل چکی ہے صاحب ۔ آپ خود ہی ان سب کا ٹھونک بجا کر معائنے کر لیجئے ۔ آپ کو یقین آجائے گا کہ یہی چی مچ کے مردے ہیں "۔ ۷

Policy Journal of Social Science Review
Online ISSN 3006-4635
Print ISSN 3006-4627
Vol. 4 No. 1 (2026)

رشید امجد کے افسانے "ایک عام آدمی کا خواب" میں جدید دور کے انسان کی بے بسی، مایوسی اور داخلی اضطراب کی نہایت مؤثر تصویر پیش کی گئی ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار ایک ایسے عام انسان کی نمائندگی کرتا ہے جو اپنے اردگرد کے ماحول میں کسی مثبت تبدیلی، نئی امید اور خوش آئند منظر کا متلاشی ہے۔ اسی خواہش کے تحت وہ روزانہ اخبارات کا مطالعہ کرتا ہے اور ٹیلی وژن کی خبروں پر نظر رکھتا ہے، اس امید کے ساتھ کہ شاید کہیں سے کسی بہتر مستقبل یا خوش خبری کی جھلک دکھائی دے۔ تاہم ہر بار اسے بدامنی، تشدد، ناانصافی، بدعنوانی اور سماجی انتشار کی خبریں ہی سننے اور دیکھنے کو ملتی ہے۔جس سے اس کی امیدیں بار بار ٹوٹتی رہتی ہیں۔یہ مسلسل ناکامی اس کے اندر شدید مایوسی، بے یقینی اور بے بسی کو جنم دیتی ہے۔ افسانہ اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ جدید انسان ترقی یافتہ دنیا میں رہنے کے باوجود ذہنی سکون، اطمینان اور امید سے محروم ہو چکا ہے۔ وہ بہتر زندگی کی خواہش تو رکھتا ہے، مگر حالات کی سختی اور معاشرتی مسائل اسے ہر قدم پر ناکامی اور اضطراب سے دوچار کرتے ہیں۔ اس طرح رشید امجد نے اس افسانے کے ذریعے عہدِ حاضر کے عام انسان کی نفسیاتی کیفیت، اس کی ٹوٹتی ہوئی امیدوں اور زندگی کی تلخ حقیقتوں کو نہایت گہرے اور مؤثر انداز میں یوں پیش کیا ہے۔

"وہی سڑاند بھرے مردہ لفظ ، ایک دوسرے کی ہاں میں ہاں ملاتے ،وہی پرانی
خبریں نئے نئے انداز سے ، وہی چہرے، صرف ماسک بدلتے ۔ یہ تو وہی لاشیں
میں صرف کفن بدل گئے ہیں ہو انھیں دیکھتے ہوئے سوچتا۔ وہ خبر کب چھپے گی" ۔

۸

افسانے کا اختتام مرکزی کردار کی موت کی خبر پر ہوتا ہے، جو اس کی تمام امیدوں، خوابوں اور بہتر مستقبل کی آرزوؤں کے خاتمے کی علامت بن جاتا ہے۔ مصنف اس انجام کے ذریعے یہ واضح کرتا ہے کہ جدید دور کے انسان کو گرد و پیش کے یکساں، فرسودہ اور مایوس کن حالات نے اس قدر بے بس کر دیا ہے کہ وہ تبدیلی کی خواہش رکھتے ہوئے بھی اسے حقیقت کی صورت میں نہیں دیکھ پاتا۔ کردار مسلسل اس امید میں جیتا ہے کہ شاید زندگی میں کوئی نیا منظر، نئی خوشی یا مثبت تبدیلی اس کا مقدر بنے، مگر ہر بار اسے مایوسی اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یوں اس کی زندگی انتظار، بے یقینی اور حسرت کی علامت بن کر رہ جاتی ہے۔

اسی فکری اور نفسیاتی کیفیت کی توسیع رشید امجد کے افسانہ "پرانی آنکھوں سے دیکھنے کا آخری دن" میں بھی ملتی ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار اپنی عینک اتارنے کے بعد اس امید سے نئی دنیا کو دیکھنا چاہتا

Policy Journal of Social Science Review
Online ISSN Print ISSN
3006-4635 3006-4627
Vol. 4 No. 1 (2026)

ہے کہ شاید اب اسے بدلتے ہوئے حالات، نئے مناظر اور زندگی کے روشن امکانات دکھائی دیں گے۔ تاہم اس کی یہ توقع بھی پوری نہیں ہوتی، کیونکہ منظر بدلنے کے باوجود حقیقت وہی رہتی ہے۔ نتیجتاً وہ ایک بار پھر مایوسی، بے معنویت اور داخلی کرب کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس طرح دونوں افسانے اس حقیقت کو اجاگر کرتے ہیں کہ جدید انسان ظاہری ترقی اور تبدیلی کے باوجود اپنے وجودی بحران، ٹوٹتی ہوئی امیدوں اور مسلسل مایوسی سے نجات حاصل نہیں کر پاتا۔ رشید امجد ان علامتی مناظر کے ذریعے عہدِ حاضر کے انسان کی نفسیاتی بے بسی، روحانی خلا اور بہتر مستقبل کی ناکام جستجو کو نہایت مؤثر انداز میں پیش کرتے ہیں۔

"وہی روڈ ، ایک دوسرے کو دھکا دے کر آگے نکلنے کی جلدی ، بے ہنگم، بے قابو
ٹریفک لائینیں ، قانون شکنی ، سفا کا نہ قہقہے، ایک دوسرے کو دھکارتے رویے ۔۔۔ ہر شے
سلگ رہی تھی لیکن کسی کانہ دکھائی دیتی نہ آگ کی تپش محسوس ہوتی۔وہ فٹ پاتھ
کے ساتھ لگے جنگلے پر جھک گیا، ٹھنڈی سانس لی اور اپنے آپ سے کہنے لگا ۔۔۔
"منظر جب تک واقعی نہ بدلے آنکھ بدلنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا" ۔۹

اس سے ظاہرہوتاہے کہ عہدِ حاضر کا حساس اور باشعور انسان جن دینی، روحانی، نفسیاتی اور جذباتی مسائل سے دوچار ہے، ان کی بھرپور عکاسی رشید امجد کے افسانوں میں ملتی ہے۔ ان کے افسانے جدید انسان کی داخلی بے چینی، تنہائی، وجودی اضطراب اور اقدار کے زوال کو نہایت گہرائی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ رشید امجد محض موجودہ حالات کی عکاسی نہیں کرتے بلکہ ماضی اور حال کے درمیان ایک مضبوط فکری اور تہذیبی رشتہ بھی قائم کرتے ہیں۔ ان کے ہاں ماضی صرف یادوں کا سرمایہ نہیں بلکہ حال کو سمجھنے اور اس کی معنویت کو واضح کرنے کا ایک مؤثر وسیلہ بن جاتا ہے۔

رشید امجد کا اسلوب اس اعتبار سے منفرد ہے کہ وہ ماضی کو اس مہارت سے حال میں سمو دیتے ہیں کہ دونوں زمانے ایک دوسرے سے الگ محسوس نہیں ہوتے۔ ان کے افسانوں میں وقتی فاصلے ختم ہو جاتے ہیں اور قاری ماضی اور حال کو ایک ہی فکری اور تہذیبی تسلسل کے طور پر محسوس کرتا ہے۔ بظاہر ان کے افسانوں میں زمانی الجھاؤ اور علامتی پیچیدگی نظر آتی ہے، لیکن غور کرنے پر یہی عناصر وقت کی گزشتہ اور موجودہ جہتوں کو ایک ہی سلسلے میں پرو دیتے ہیں۔ اس طرح ان کے افسانے انسانی تجربے کی ہمہ گیری اور وقت کی مسلسل روانی کو نمایاں کرتے ہیں۔یہ رجحان ان کے متعدد افسانوں، مثلاً "بے ثمر عذاب"، "دھند" اور "چپ فضا میں تیز خوشبو" میں واضح طور پر دیکھا جا سکتا

Policy Journal of Social Science Review
Online ISSN 3006-4635
Print ISSN 3006-4627
Vol. 4 No. 1 (2026)

ہے۔ ان افسانوں میں وقت محض ماضی، حال یا مستقبل کی الگ الگ اکائیاں نہیں رہتا بلکہ ایک مسلسل بہاؤ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔جہاں ماضی کے تجربات حال کی تشکیل کرتے ہیں اور حال مستقبل کی سمت متعین کرتا ہے۔ یہی زمانی تسلسل، تہذیبی شعور اور انسانی تجربے کی گہرائی رشید امجد کے افسانوں کو جدید اردو افسانے میں ایک منفرد اور ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔

اردوکے جدید افسانہ نگاروں میں رتن سنگھ کی حیثیت ایک منفرد اور رجحان ساز افسانہ نگار کی ہے۔جنہوں نے روایتی افسانوی اسلوب سے ہٹ کر اپنے لیے ایک الگ فکری اور فنی شناخت قائم کی۔ اگرچہ ان کے افسانوں میں علامت نگاری اور تجریدیت کا استعمال نسبتاً محدود ہے، تاہم یہ عناصر ان کے فن کو معنوی گہرائی اور فکری وسعت عطا کرتے ہیں۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں محض علامتی اظہار پر انحصار کرنے کے بجائے زندگی کی حقیقی صورتِ حال، سماجی تبدیلیوں اور انسانی تجربات کو زیادہ اہمیت دی ہے۔جہاں بیشتر جدید افسانہ نگار انسانی تنہائی، داخلی کشمکش، وجودی بحران اور ماضی کی بازیافت کو اپنے افسانوں کا بنیادی موضوع بناتے ہیں،وہیں رتن سنگھ ماضی کے ساتھ ساتھ حال کے بدلتے ہوئے سماجی، معاشی اور نفسیاتی حالات پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں روزمرہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل، عام انسان کی جدوجہد، معاشرتی تضادات اور عہدِ حاضر کی پیچیدگیوں کو نہایت حقیقت پسندانہ اور فنی مہارت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ وہ جدید انسان کے مسائل کو صرف انفرادی سطح پر نہیں بلکہ وسیع سماجی تناظر میں بھی دیکھتے ہیں، جس سے ان کے افسانے اپنے عہد کی مؤثر دستاویز بن جاتے ہیں۔رتن سنگھ کے افسانوں کی ایک نمایاں خصوصیت ان کے موضوعات کا تنوع اور اسلوب کی تازگی ہے۔ وہ ہر افسانے میں زندگی کے کسی نئے پہلو کو اجاگر کرتے ہیں اور روایت سے ہٹ کر نئے طرزِ اظہار اختیار کرتے ہیں، جس کے باعث ان کے افسانوں میں فکری تازگی اور فنی انفرادیت نمایاں نظر آتی ہے۔ ان کی یہ خصوصیات انہیں جدید اردو افسانے کے اہم اور منفرد تخلیق کاروں میں شامل کرتی ہیں۔

ان تمام اوصاف کی واضح جھلک ان کے معروف افسانہ "ہزاروں سال لمبی رات" میں بھی دیکھی جا سکتی ہے۔جہاں عہدِ حاضر کے حساس انسان کی بے بسی، داخلی کرب، معاشرتی مسائل اور نفسیاتی الجھنوں کو نہایت مؤثر اور حقیقت پسندانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس افسانے میں جدید انسان کی تنہائی، مسلسل جدوجہد اور بہتر زندگی کی ناکام آرزو کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ قاری اپنے عہد

Online ISSN 3006-4635 Print ISSN 3006-4627
Vol. 4 No. 1 (2026)

کی تلخ حقیقتوں سے براہِ راست آشنا ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر قمر رئیس نے بھی رتن سنگھ کے افسانوی فن کی انفرادیت، عصری شعور اور فکری وسعت کو نمایاں اہمیت دی ہے۔وہ لکھتے ہیں کہ۔

""""ہزاروں سال لمبی رات "میں رتن سنگھ نے ازلی گرسنگ ، ذلت و خواری اور محرومیوں کا شکار جن لوگوں سے اپنا تشخیص قائم کیا ہے وہی اس دھرتی کے سپوت ، اس کے وفا دار اس کے محافظ اور وارث ہیں ۔ رتن سنگھ اپنی نشتر جیسی کہانیوں میں اگر ایک طرف اس کے کبھی نہ ختم ہونے والے دکھوں کا گا تھا سناتا ہے تو دوسری طرف ان کی معصومیت او راپنی زمین اور اس کی تہذیبی روایتوں سے اس کی وابستگی کو بھی ایک پل کے لئے نہیں بھولتا"۔۱۰

Policy Journal of Social Science Review
Online ISSN Print ISSN
3006-4635 3006-4627
Vol. 4 No. 1 (2026)

ایک اورجگہ بقول ڈاکٹر نگہت ریحانہ اس کااظہاریوں ہواہے۔

"ڈر، خوف اور سوچ کا رجحان ، ذہنی انتشار، ہجرت اور جلا وطنی ، سفر، داخلی یا دنی کیفیات ، کرب ، تنہائی کا احساس ،محرومی و مایوسی ، احتجاج ، بازیافت یا کھوئے ہونے انسان کی تلاش، یہ تمام رجحانات و موضوعات اس بات کا ثبوت ہیں کہ ساتویں دہائی میں اردو افسانے کا کینوس کافی وسیع ہوا"۔۱۱

جدید افسانے کی ایک اہم خصوصیت اس کے اسلوب کی تازگی، علامتی گہرائی اور موضوعات کی وسعت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں افسانے کے موضوعات اور اظہار کے طریقوں میں نمایاں تبدیلی رونما ہوئی۔ اگرچہ بعض ناقدین نے جدید افسانے پر ابہام، تجریدیت اور پیچیدگی کے الزامات عائد کیے اور اس کے بارے میں منفی آرا کا اظہار بھی کیا، تاہم اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ جدید افسانہ نگاروں نے قومی سانحات، سماجی مسائل اور انسانی المیوں کو نہایت جرات، بے باکی اور فنی مہارت کے ساتھ پیش کیا۔ انہوں نے اپنے عہد کے سیاسی، سماجی اور تہذیبی بحرانوں کو محض بیان ہی نہیں کیا بلکہ ان کے باطنی اور نفسیاتی اثرات کو بھی گہرائی سے آشکار کیا۔

موضوعاتی اعتبار سے دیکھا جائے تو جدید افسانے میں ترقی پسند تحریک کی طرح ہجرت کا درد اور اس سے وابستہ انسانی المیے بھی نمایاں طور پر موجود ہیں، لیکن جدید افسانہ نگار صرف ہجرت کے واقعے تک محدود نہیں رہتے۔ وہ ہجرت کے طویل المدت نفسیاتی، سماجی اور تہذیبی اثرات، شناخت کے بحران، رشتوں کی شکست و ریخت، انسانی بیگانگی اور اس کے نتیجے میں جنم لینے والے فسادات، تشدد اور خون ریزی کو بھی اپنے افسانوں کا حصہ بناتے ہیں۔ اس طرح جدید اردو افسانہ اپنے عہد کی زندہ دستاویز بن کر سامنے آتا ہے، جو نہ صرف انسان کے باطن کی پیچیدگیوں کو آشکار کرتا ہے بلکہ اپنے زمانے کے تاریخی، سماجی اور تہذیبی حقائق کو بھی گہرے فنی شعور کے ساتھ محفوظ کر دیتا ہے۔

مجموعی طورپر یہ کہاجاسکتا ہے کہ جدید اردو افسانہ نگاروں نے روایت کے محدود دائرے سے نکل کر زندگی کے متنوع موضوعات اور عہدِ حاضر کے پیچیدہ مسائل کو اپنے افسانوں کا مرکز بنایا۔ انہوں نے فرد کی داخلی کشمکش، وجودی بحران، سماجی انتشار، تہذیبی زوال، ہجرت، بیگانگی، تنہائی، اخلاقی انحطاط اور جدید زندگی کے مختلف نشیب و فراز کو نئے فنی اور فکری انداز میں پیش کیا۔ اگرچہ علامتی اور تجریدی اسلوب کی وجہ سے جدید افسانہ ابتدا میں عام قارئین اور روایتی ذہن رکھنے والے ادیبوں کے لیے قدرے دشوار محسوس ہوا، کیونکہ وہ روایتی بیانیے کے عادی تھے، لیکن وقت گزرنے کے ساتھ یہی اسلوب جدید

افسانے کی انفرادیت اور امتیاز کی علامت بن گیا۔ اس نئے طرزِ اظہار نے نہ صرف افسانے کے فنی معیار کو وسعت بخشی بلکہ اس کی تعبیر و تفہیم کے لیے بھی نئی تنقیدی بصیرت کی ضرورت کو اجاگر کیا۔

حوالہ جات

۱۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ،اردوافسانہ:روایت اور مسائل،ہندوستانی اکیڈمی دہلی،۲۰۰۵ء،ص ۶۳۶

۲۔کلام حیدری،صفر،ص۱۲۵

۳۔کلام حیدری،قصہ رات کا،ص۴۲

۴۔ایضاً،ص۱۵۱

۵۔جوگندرپال،عفریت(جوگندرپال کےافسانوں سےانتخاب)،ص۱۸

۶۔ایضاً،ص۱۸

۷۔ایضاً،ص۱۱۵

۸۔رشیدامجد،ایک عام آدمی کاخواب،پورب اکادمی اسلام آباد،۲۰۰۰ء،ص۱۸

۹۔ایضاً،ص۱۸

۱۰۔ قمررئیس،گیان دھیان کامسافر،مشمولہ چہارسو(رتن سنگھ نمبر)دہلی،ص۱۸

۱۱۔ڈاکٹرنگہت ریحانہ خان،اردوافسانہ فنی اور تکنیکی مطالعہ،فکشن ہاوس لاہور،۱۹۸۹ء،ص۲۲۹